مسلم تہذیب و ثقافت کی بقاء: مسلمانوں کی علمی، سیاسی ومعاشی ترقی تحریک آزادی کے تناظر میں

سیدہ شائستہ عشرت*

منزہ حیات**

Abstract

The Muslims endeavoured to survive their civilization, culture and religion in subcontinent at the time of British rule. Because after political dominance, one aim of the British was to disseminate western science, culture, and civilization in subcontinent. Thereafter, a debate among Muslim scholars started that either to accept all this or start a new age with their own culture, sciences and civilization. Therefore, three main school of thought came into exist, one group was in favour of British and had opinion to get western science and collaborate with British for the development of subcontinent. While the second group thought, no need to adopt the western science and they were also against the western culture and civilization. The third school of thought gave a point of view that Muslims should develop their nation and get western knowledge but without demolishing their religious and cultural identity. Practically, the third school of thought remained successful because they had a vision of contemporary and future era. This group was in line with Islamic teachings and

* پی ایچ۔ڈی سکالر، سابقہ پراجیکٹ ریسرچر شعبہ علوم اسلامیہ ،بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

** اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ ،بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

moderate thought had got a success and appreciation from the society.

Keywords: Islamic civilization and culture, modern sciences, Allama Muhmmad Iqbal, Indian independence movement, Educational and Economical devalopment

تلخیص

برصغیر کے مسلمانوں کی ایک صدی کی تہذیبی، ثقافتی، فکری، اور مذہبی تاریخ کا منظر غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مغلوں کے زوال اور انگریزوں کی آمد کے بعد ہی سے مسلمانوں کے زوال کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ جب انگریز آ ئے تو نو آبادیاتی نظام کے ساتھ انہوں نے حکومت وسیاست میں بھی اپنا مقام بنانا شروع کیا۔ اس غلامی کے دور میں مسلمانوں کو تہذیبی، ثقافتی، سماجی و معاشرتی لحاظ سے انتہائی بے دردی سے کچلا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ معاشرتی لحاظ سے مسلمان بڑی بڑی جاگیر وں اور حکومتی عہدوں پر بھی فائز تھے۔ مگر جیسے ہی ان سے وہ جاگیریں اورسرکاری عہدے چھین لیے گئے وہ مفلس اور غریب ہو گئے۔ اس مقالے میں مسلم تہذیب کی بقا اور مسلمانوں کی علمی، سیاسی و معاشی ترقی کو تحریک آزادی کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔

قاضی جاوید اپنی کتاب ''سرسید سے اقبال تک''میں کچھ اس طرح رقمطراز ہے۔

> ''آئندہ خطرات کے انسداد کے خیال سے مسلمانوں کو ہر طرح سے تباہ برباد کردیا گیا۔ ہزاروں لوگ جو مختلف حیثیتوں سے سربرآوردہ تھے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔باعزت لوگ بے عزت کئے گئے۔ دولت مند اور خوشحال گھرانے مفلس ومحتاج بنا دیئے گئے۔ اور جزبہ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پوری قوم کوظلم وستم کا شکار بنا کر ایسے مصائب میں مبتلا کردیا گیا۔ جن سے نجات پانے کی کوئی صورت نظرنہیں آتی تھی''[۱]

اس پس منظر کی عکاسی ڈاکٹر کنیز فاطمہ اپنی کتاب میں کرتی ہیں اور کچھ اس طرح لکھتی ہیں کہ

> ''انگریز اس وقت ۱۵۰ سال سے ہندوستان میں ایک طاقتور حیثیت سے موجود تھا۔ مسلمانوں کو معاشی، سماجی، تہذیبی، ہر سطح پر مجروح کیا گیا۔ مسلمان تعلیم اور اپنے دور کے

تقاضوں سے بے بہرہ تھے۔ معاشی نظام بدل چکا تھا۔ ان کو نہ تو نوکری ملتی تھی نہ وہ کسی اور طریقے سے روزی کما سکتے تھے۔ مذہبی رجحانات اس قسم کے تھے کہ مغربی تعلیم حاصل کرنا کفر تصور کیا جاتا تھا۔ ایک شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ آبا ؤ اجداد کی روایات سے منضبط تھے۔اور ہر طرح کی بدحالی کے باوجود اپنے موروثی فکر وعمل میں تبدیلی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ۔۔۔۔۔۔ اس وقت یہ بارآور کرایا گیا کہ سفید آدمی ترقی یافتہ اور مہذب ہے۔ یہ اس کی فراخ دلی ہے کہ اس نے رنگدار قوموں کو تہذیب اور علم وفنون کی خوبیوں سے شناسا کروانے کے لیے ان کی تعلیم ،صحت، اور ترقی کا بوجھ اپنے ذمے لے لیا ہے۔ جب رنگدار لوگ تعلیم حاصل کرلیں گے تو سفید لوگ اپنے ملک چلے جائیں گے۔ ۔۔۔مغربی تعلیم سے مستفید ہونا تہذیب و ترقی کی پہلی سیڑھی بن گیا ''۲

اس لحاظ سے تا ریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی قوم پر کوئی دوسری قوم فاتح بن کر غالب آتی ہے تو وہ سب سے زیادہ ان کی معاشرت ،تہذیب وثقافت مذہب، زبان اور روایات کو متاثر کرتی ہے۔ اور مغلوب قوم غلامی کی وجہ سے غالب اورفاتح قوم کی طرز معاشرت کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس اصول معاشرت و تہذیب کا ذکر ابن خلدون '' مقدمہ ابن خلدون''میں کرتے ہیں۔

'' انسان فاتح قوم کے کمالات کا اعتماد رکھتا ہے۔ اور مفتوح قوم نہ صرف جسمانی غلامی قبول کرتی ہے۔ بلکہ ان کے ذہن بھی غلام بن جاتے ہیں کیونکہ مفتوح کی نگاہ میں فاتح کی عظمت سما جاتی ہے۔ یا وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ کہ فاتح قوم میں کوئی غضب کا کمال ہے جس کی وجہ سے حکومت کا مالک بن بیٹھا ہے۔ ۔۔۔۔۔اس لیے تم دیکھو گے کہ مفتوح ،فاتح کے ہر فعل کی نقل کرتا ہے۔ کھانے پینے میں، پہننے اوڑھنے میں، رہنے سہنے میں، سواریاں رکھنے میں، اسلحہ کی شکل وصورت میں بلکہ اس کی ہر ادا میں مشابہت قبول کر لیتا ہے۔''۳

ابن خلدون کے اصول کی عکس بندی انگریز کے دور میں مسلمانوں کے دور زوال میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسا کہ ابن خلدون نے بیان کی ہے۔ اس لحاظ سے برصغیر کے لوگوں میں بھی انگریزی طرز معاشرت رواج پاتی جا رہی تھی۔اور ترقی پسند لوگ علمی، معاشی ترقی کے لیے انگریزی علم وفن بہت تیزی سے اپنا رہے تھے۔یہ بات ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی معاشرے کی ثقافت بدل دی جائے تو کوئی بعید نہیں کہ جس

معاشرت اور تہذیب کو اپنایا گیاہے اس کو اس قوم کی علم وفنون کے ساتھ ساتھ ان کی اقدارکو بھی اپنا لیا جائے۔ اور اس قوم کی سیاسی اور حکومتی پالیسی کو بھی من وعن تسلیم کرلیا جائے۔ طارق جان اپنی کتاب'' سیکولرازم مباحث اور مغالطے ''میں لکھتے ہیں۔ ''میں اس سوچ میں حق بجانب ہوں کہ اگر آپ کسی قوم کے سماجی نظام کے ثقافتی عنصر کو تبدیل کر دیں تو انجام کار آپ اس کی خارجہ پالیسی کو بھی بدل سکتے ہیں''۔[۴]

یہ بات واضح ہے غالب قوم بہر حال مفتوح قوم کی ثقافت وتہذیب ،تمدن، مذہب، علم وفن، فکرو فلسفہ، معاشرت ومعیشت ان تمام پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ اور مفتوح قوم اس طرح فاتح قوم کی معاشرت کو اپنا لیتی ہے۔ اور اس کے رنگ ڈھنگ اپنا لیتی ہے۔ اور اپنا تشخص کھودیتی ہے۔ اور فاتح قوم میں ضم ہو جاتی ہے۔ اور کوئی علیحدہ سے قوم نہیں رہتی۔

اسی طرح ایک اورمقام پر طارق جان اپنی کتاب ''سیکولرازم مباحث اور مغالطے'' میں لکھتے ہیں ''انسانی زندگی مصائب کا شکار ہو جاتی ہے بلکہ نری جہنم بن جاتی ہے جب دو ادوار، دو ادیان اور دو ثقافتیں ایک دوسرے پر چھانے اور اسے ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہیں''[۵]

انگریز دور کی اوج کمال کی ترقی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک نہایت حیرت انگیز شے تھی۔ مگر دن بدن برطانوی حکومت اسے ہندوستان میں پھیلا رہی تھی۔ اور مسلمان انگریز حکومت سے اختلاف رکھنے کے باوجود اسے اپنا رہے تھے۔ عسکری، علمی، سائنسی ٹیکنالوجی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور مسلمانوں کا ان جدید علوم سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے روزگار میں مشکلات تھیں۔ جبکہ قدیم فنون اور علوم کا استعمال بہر حال کم ہوتا جا رہا تھا۔

اس موضوع کا ذکر ڈاکٹر فاطمہ یوسف اپنی کتاب ''اقبال اور عصری مسائل'' میں کرتی ہیں۔

> ''کمپنی کے دور اور برطانوی حکومت کی دوصدیاں متعدد تہذیبوں میں تصادم کی صدیا ں تھیں۔ برطانوی جدیدیت نے برصغیر پاک و ہند میں پرانی تہذیبوں کو اتنا بڑا چیلنج پیش کیا تھا کہ وہ ایک حد تک لڑکھڑا گئی تھیں۔ مسلم تہذیب کے لیے یہ تصادم بڑے گہرے

اثرات کا حامل تھا۔ مغربی تہذیب ہر لحاظ سے طاقت کا مظہر تھی۔ عسکری اور سائنسی ایجادات پر مبنی قوت تو مسلمانوں کی سمجھ میں آتی تھی۔ کیونکہ یہ حواس خمسہ کی حدود میں تھی۔ انگریز کی فوج بڑی مستعد اور ہر طرح کے جنگی ہتھیاروں سے لیس تھی۔ انہوں نے تار برقی، ریل، گاڑی، بحری جہاز،سڑکیں ،نہریں اورانتظامیہ کے دفاتر تعمیر کیے گئے''[۶]

مغربی تہذیب میں شامل تمام ترمغربی سائنسی ایجادات علم وفنون اور ان کے نظریات شامل تھے جو ان کی قومیں اپنے ملکوں میں اپنا کر ترقی کی راہوں پر گامزن تھیں۔ اب یہ معلوم کرناضروری ہے کہ مشرقی تہذیب دراصل کن بنیادوں پر قائم تھی اور کس طرح یہ مشرقی تہذیب غالب مغربی تہذیب سے متاثر ہو رہی تھی۔

مسلم تہذیب وثقافت کی تعریف واہمیت

مسلم تہذیب و ثقافت کا اگر جائزہ لیا جائے یہ بات بہت ہی عجیب محسوس ہو گی کہ مسلم تہذیب پوری دنیا میں یکساں نہیں ہے خاص طور پر تہذیب کے وہ مظاہر جو پوری دنیا کی تہذیبوں کے مظاہرمیں یکساں نظر آتے ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب میں یکساں نہیں ہیں۔ پوری دنیا میں مسلمان، لباس، رہن سہن، تمدن کے لحاظ سے آپس میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر پھر بھی کچھ ایسی بنیادی چیزیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور وہ پوری دنیا میں ہمیں یکساں نظرآتے ہیں۔ ایک عام تہذیب کی تعریف کے بارے میں کنیز فاطمہ اپنی کتاب ''اقبال اور عصری مسائل'' میں ''تہذیبی قدروں کا زوال'' کے موضوع کے تحت لکھتی ہیں ''جب کوئی ثقافت علم وہنر، نظم وضبط، فہم وتخلیق،دولت وحشمت کے ارتقاء کے باعث ایک خاص تمدنی مقام حاصل کرلیتی ہے۔ تو تہذیب کہلاتی ہے۔''[۷]

تہذیب کی یہ تعریف دنیا کے تمام تہذیبوں پر صادق آتی ہے۔ اور اسی تعریف کے تحت دنیا کی مختلف تہذیبیں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اورایک شناخت رکھتی ہیں۔ جبکہ اسلامی ثقافت کی تعریف تہذیب کی اس عام تعریف سے قدرے مختلف ہے۔ اور اس کی بنیاد میں یہ سب چیزیں نہیں بلکہ ان کی بنیاد دراصل کسی اور نظریہ پر ہے۔ اسلام کے پیش نظر یہ سب چیزیں بھی ضروری ہیں مگراسلام اپنے نظریے کے تحت ان تمام شعبہ زندگی کو اہمیت دیتا ہے۔

اس بارے میں مولانا مودودی ''اسلامی تہذیب وتمدن'' میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ''لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب کا نام ہے اس کے علوم وآداب، فنون لطیفہ، صنائع وبدائع، اطوارو معاشرت، اندازتمدن اورطرزسیاست کا مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں ہے نتائج ومظاہر ہیں تہذیب کی اصل نہیں ''۸ اسی طرح ''اسلامی تہذیب وتمدن''میں ایک اور مقام پر مولانا مودودی لکھتے ہیں۔ ''تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کی تعمیر ان تکوینی پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔ (۱) دنیوی زندگی کا تصور (۲) زندگی کا نصب العین (۳) اساسی عقائد و افکار (۴) تربیت افراد (۵) نظام اجتماعی۔''۹

مسلمانوں کی تہذیب کا تعلق مذہب کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ اور اس کی تہذیب پر دوسرے تمام اثرات سے زیادہ مذہب کا اثر ہے۔ اس کی بنیادوں میں اسلام کے عقائد وافکار ہیں۔ اس لحاظ سے مسلم تہذیب کے ڈھانچے اور اسلامی تمدن کی عمارت پر مذہب کا رنگ نمایاں ہے۔

اس کے بارے میں ابوالحسن ندوی اپنی کتاب ''اسلامی تہذیب و ثقافت'' میں لکھتے ہیں۔ ''انبیاء نے صرف عقیدہ شریعت اور ایک نئے دین ''اسلام''ہی کی دعوت نہیں دی بلکہ وہ تہذیب و تمدن اور نئے طرز حیات کے بانی ہوتے ہیں۔ جو ''ربانی تہذیب'' کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔ اس تہذیب کے کچھ مخصوص اصول و ارکان اور شعائر و علامات ہیں۔ جن کے ذریعے وہ دوسری تہذیبوں اور جاہلی تمدن سے نمایاں اور ممتاز ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب کا پہلا عنصر دینی عقائد۔اسلامی اصول زندگی، اور اخلاقیات ہے۔۔۔مسلمان دنیا کے کسی ملک، کسی گوشے میں بستے ہوں اور ان کی زبان ان کا لباس خواہ کچھ بھی ہو۔یہ قدر مشترک ان میں ضرور پائی جاتی ہے اور اس کی بناء پر وہ ایک خاندان کے افراد اور ہر جگہ ایک ہی تہذیب کے حامل نظر آتے ہیں۔ اسی مشترک عنصر کے لحاظ سے دنیا کے سارے مسلمان ایک مخصوص تہذیب رکھتے ہیں۔''۱۰

دراصل اسلام کے نظریے کی بنیاد توحید، سنت رسول، اور قرآن کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ اور اگر کہیں کوئی حکم قرآن میں موجود نہ ہو تو اس کے لیے انسانی عقل

استعمال کی جائے گی۔ اور جو بھی اصول یا قانون بنایا جائے گا وہ قرآن وسنت سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ عقل اور زمانے کے بھی موافق ہو۔

اسی طرح کنیز فاطمہ اپنی کتاب ''اقبال اور عصری مسائل'' میں ایک مقام پر لکھتی ہیں۔ ''مسلم تہذیب ایک ایسے نظام کا نام ہے جس نے خدا اور کائنات کے ساتھ انسان کے رابطوں کے اصول بیان کیے جو فکروعمل کے تمام طریقوں کا احاطہ کرتے ہیں اور یہ اصول جامد نہیں، متحرک ہیں۔ ان اصولوں کا منبع قرآن، رسول ﷺ کی ذات اور عوام کی قوت تخلیق ہے۔''[۱۱]

اس لحاظ سے مسلم تہذیب کی بنیاد توحید، کتاب اللہ، سنت رسول ،اجماع، قیاس اور اجتہاد ہے۔ اور یہ اصول زریں صرف مسلم ثقافت کا ہی خاصہ تھا۔ کسی اور تہذیب کی خصوصیات نہیں تھیں۔ جس کی وجہ سے مسلم تہذیب دوسری تمام تہذیبوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ اور اس تہذیب کے بنیادی اصول وقت اورزمانہ کے سہ بختیوں کی نظر نہ ہوسکی جیسا کہ ہمیں دوسری بہت سی تہذیبیں وقت کی تیرہ بختیوں کی نذر ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مسلم مفکرین کے نزدیک دنیا میں تمام ثقافتوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جس کا ذکر معید الظفر اپنی کتاب'' تہذیبی تصادم اور فکر اقبال'' میں کرتے ہیں۔

> ''ا: اسلامی ثقافت ۲: جاہلی ثقافت۔ اسلامی ثقافت ایک ایسی ثقافت ہے جو اسلام کے نظریہ حیات پر قائم ہے۔ جبکہ جاہلی ثقافت کی اساس وبنیاد ان کے نزدیک فکر انسانی کو مرجع صحت و عدم قرار دیتا ہے جس سے یہ انسانی فکر الہ بن جاتی ہے۔ اور ایسی ثقافت اللہ کی ھدایت سے محروم رہ جاتی ہے۔''[۱۲]

برصغیر کی ثقافت پر خصوصیت سے بات کرنے سے پہلے اس کی تاریخ اور ماضی کے حالات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ برصغیر میں علم کی حکومتی سطح پر کبھی سرپرستی نہیں ہوئی۔ اور فلسفہ، تاریخ، سائنس، ٹیکنالوجی، شعروادب کے کوئی خاص ادارے قائم نہیں ہوئے تھے۔ کبھی کبھی علم کی کوئی شمع کہیں کسی دور میں نظر آتی ہے۔ اور زیادہ تر علم دینی درسگاہوں کی صورت میں تھا۔ جن میں سائنس اور جدید علوم کی بجائے صرف قرآن،

حدیث، فقہ، منطق وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یا پھر صوفیا کی خانقاہیں جہاں سے دینی اور روحانی تعلیم وتبلیغ دی جاتی تھی۔

برصغیر میں جب برطانوی دور آیا تو انگریز نے معاشرتی، سیاسی، علمی، عسکری، معاشی لحاظ سے اپنا اثر یہاں کی ثقافت پر ڈالنا شروع کیا۔ تو یہاں پر بھی علم کی تقسیم ہو گئی اور علم دوحصوں میں بٹ گیا۔ فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، قانون، سیاست، انتظامیہ، عسکری، تربیت کے مراکز انگریز کے پاس چلے گئے۔ جبکہ عربی، فارسی، علم قرآن، علم حدیث، علم فقہ مسلمان معلم کے پاس رہ گئے۔ اس لحاظ سے سائنسی علوم، اقتصادیات اور معاشیات کا جو علم انگریز اپنے ساتھ لائے تھے اس کو سیکولر سمجھا گیا۔ اور اس کو اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھا گیا۔ اس لیے کہ یہ وہ علوم تھے جن کا برصغیر کے مدارس میں کو ئی تصور نہ تھا۔ انگریزی کے خلاف تو باقاعدہ جہاد کیا گیا۔

اس لحاظ سے مسلم تہذیب و ثقافت اپنے عقائد و افکار کی وجہ سے دوسری تہذیبوں سے منفرد تھی خصوصی طور پر مغربی تہذیب سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ جب مغربی تہذیب نے برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی و خوش حالی پر اثرات مرتب کیے تو مسلم اہل فکر ودانش کو اس کی اس قدر فکر نہ ہوئی۔ مگر جب مغربی تہذیب نے مسلمانوں کی فکر اور اندازفکر کو متاثر کیا۔ اور ان افکار کی بنیاد پر بننے والی تہذیب کو متاثر کیا جس کا تعلق دین سے تھا تو اہل علم ودانش نے مسلم تہذیب کو بچاتے ہوئے مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی اور روزگار کے لیے فکری انداز میں جدوجہد شروع کی۔ اس فریضہ کی سرانجام دہی میں مفکرین تین گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ ان تین گروہوں کا مقصد اسلامی تہذیب وثقافت کو بچاتے ہوئے مسلمانوں کو زوال اور پستی سے نکال کر ترقی و خوشحالی کی طرف گامزن کرنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک گروہ نے ایک خاص نقطہ نظر اختیار کیا۔ اور اس کا فکری اور عملی طور پر مظاہرہ کیا۔

ان تین سماجی و سیاسی مفکرین کے مکاتب فکر درج ذیل ہیں۔

ا: ان میں سے پہلے گروہ کا موقف یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی پستی اور زوال کی وجہ ان کی جہالت ہے۔ اور ان کے خیال میں تعلیم، تعلیم اورصرف تعلیم ہی ان کی

اس خراب حالت کو درست کرنے کا علاج ہے۔ اور اوراس تعلیم سے مراد مغربی تعلیم ہوتی ہے۔ اور ان کے مطابق مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلش کاسیکھنا ضروری ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کی ترقی صرف اور صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ جدید مغربی علوم حاصل کریں اور ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ اور ان مغربی علوم سے استفادہ کے لیے ایک نئے علم الکلام کے اشد ضرورت ہے جو ان مغربی علوم سے بحث کر سکے اور ان میں سے جو موافق نظریات ہوں ان کو اپنی تعلیمات میں شامل کر لیا جائے اور جو مخالف ہوں ان کی تردید کردی جائے۔ اسلامی نظریات کی تشکیل جدید یا تشکیل نو کی جائے۔ اور یہاں تک کہ مغربی طور اطوار سیکھ کر اپنے آپ کو ان مغر بی ا قوام جو کہ مہذب ،تعلیم یافتہ اورترقی یافتہ قوموں کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کریں۔ اور دنیا میں اپنے آپ کو ترقی پزیر اقوام سے نکال کر ترقی یافتہ اقوم میں شامل کرنے کی جدوجہد کریں۔ برصغیر میں اس مکتبہ فکر کے رہنماء سرسید احمد خان ہیں۔ اور ان کے بعد سید امیر علی اور مولوی چراغ علی بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ اپنے نقطہ نظر کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک ادارہ'' علی گڑھ'' کے نام سے قائم کیا۔ اور اپنے افکار کا پرچار کیا۔

۲: دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنے روایتی علوم کی حفاظت کرنی چاہئیے۔ اور اس گروہ کے ارباب فکرونظر نے مغربی نو آبادیاتی نظام کی مخالفت تمام جدید علوم وفنون کی نفی کی۔ اس کی وجہ محض رجعت پسندی اور قدامت پسندی نہیں تھی بلکہ ان کے خیال میں جدید علوم صرف جدید علوم نہیں ہیں بلکہ ان جدید علوم کو قبول کرنا دراصل استعمار کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے غیر ملکی علوم جدیدہ کی نفی دراصل غیرملکی حکمرانوں کی برتری رد کرنے کے مترادف تھی۔ اس مکتبہ فکر کے راہنماء شیخ الہند محمودالحسن ہیں۔ اور ان کی سربراہی میں ''دارالعلوم دیوبند'' فعال رہا۔

یہ ادارہ دینی اور روایتی علوم کے لیے بے حد مقبول اور اور سیاسی لحاظ سے انتہائی سرگرم رہا۔ یہ مکتبہ فکر قرون وسطی کی مذہبی فکر سے آگے نہ بڑھ سکے اور وہ اس عقیدے پر

سختی سے قائم رہے کہ اجتہاد کا دروازہ اب بند ہوچکا ہے۔ اور اس صور ت میں اسلامی تصورات یا الہیات کی تشکیل نوکا تو خیر کوئی جواز ہی موجود نہیں۔ اس مکتبہ فکر نے مشرقی علوم، روایتی علوم، دینی علوم، اسلامی تہذیب وثقافت سب کو تو محفوظ کر لیا لیکن برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی اور معاشی خوشحالی کے لیے کوئی لائحہ عمل پیش نہ کرسکا۔

۳: تیسرے گروہ کے خیال میں مسلمانوں کو مغربی جدید علوم سے مکمل طور پر استفادہ کرنا چاہئیے۔ اور ان جدید علوم کے حصول میں اجتہاد کا دروازہ درپیش مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ کھلا ہونا چاہئیے۔ اوراسلامی الہیات کی تشکیل جدید بھی لازمی جز ہے جدید علم الکلام سے بحث بھی ہو۔ مگر یہ سب اسلامی تہذیب وتمدن کو محفوظ رکھتے ہوئے یعنی اپنی شناخت اور اپنی خودی کو برقرار رکھتے ہوئے برصغیر کے مسلمانوں کی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے کام کیا جائے۔ مسلمانوں کو اپنا تشخص برقرار رکھنا چاہئیے۔اس مکتبہ فکر کے سرخیل علامہ محمد اقبال ہیں۔ اور پھر کچھ پہلوؤں سے اختلاف رکھنے کے باوجود مولانا شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی بھی ان کے ہم خیال ہیں۔

اس دور میں جب مغربی ممالک علم ودانش کے لیے یونیورسٹیاں قائم کر رہے تھے اس وقت ہمارے ہاں مساجد و مقبروں اور مدارس کی تعمیرات کا کام جاری تھا۔ جوکہ مسلم ثقافت کی علامت تھے۔ درس نظامی کی طرز پر بننے والے ان مدارس کو قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح سے ہی مسلمان ترقی کریں گے۔ مگر یہ تعبیر کیسے ہو گی؟ کیا ہوگی؟کون کرے گا ؟ اور اس پر عمل درآمد کا کیا طریقہ ہو گا ؟ یہ سب کچھ ندارد تھا۔ کیوں کہ صرف یہی مدارس ہی علمی مراکز تھے جہاں سے مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی، معاشرتی سماجی اور سائنسی ترقی کی امید تھی۔ مگر ان مراکز میں دنیاوی امور کہ جس کے ذریعے غربت اور جہالت سے نکلتے ،ترقی اور خوشحالی کر کے دوسرے ملکوں کے برابر آتے یا باہر سے آنے والے خطرات کا مقابلہ کرتے۔ اس کے لیے کوئی ان اداروں میں خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔

سرسید احمد خان کی مسلمانوں کی ترقی کے لیے جدوجہد:

اس دور میں جب انگریزی حکومت اپنی تمام ترقی اور ٹیکنالوجی کے ساتھ برصغیر میں حکومت کر رہی تھی اور اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کی مکمل کوشش کر رہی تھی اس وقت میں اسے سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں سے تھا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار ضرور حاصل کریں گے اور اپنی تہذیب وثقافت کی بقا کی جنگ ضرور لڑیں گے۔ اس لیے انگریزی سرکار کی طرف نوکری کے مواقع کم میسر آنے کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی حالت انتہائی مخدوش تھی۔

ان حالات میں سرسید احمد خان ایک طرف تو مسلمانوں کی حالت دیکھتے کہ معاشی لحاظ سے انتہائی کمزوراوردوسری طرف انگریزوں کی ترقی اور ٹیکنالوجی اور ان کی جدید تہذیب وتمدن ہے جس سے عوام متاثرہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ انگریزوں کی زبان سیکھنے جدیدعلوم اور ان کی جدید تہذیب وتمدن اپنانے کی تلقین کرتے۔ انگریزوں سے غداری کو مذہبی لحاظ سے بھی درست نہیں سمجھتے تھے۔ اور انگریزوں کو اہل کتاب کے دائرہ کار میں رکھتے ہوئے ان سے میل جول، لین دین، کھاناپینا سب جائزقراردیتے تھے۔اور مسلمانوں سے یہ کہتے تھے کہ ان کی پستی کی وجہ ان کی اپنی جہالت ہے۔ جدید علوم حاصل کیے بغیر مسلمان زندگی کے میدان میں آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

قاضی جاوید صاحب اپنی کتاب ''سرسید سے اقبال تک'' میں سر سید احمد خان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک جلسے میں آپ نے فرمایا کہ''اس زمانے میں یہ چیز دیکھنے کے قابل ہے کہ کون سی چیز اب ہمارے ملک کے لیے مفید ہے ؟کون سے علوم ہم کو مہذب بنا دیں گے؟اور کس زبان کا سیکھنا ہماری شائستگی کو ثابت کرے گا ؟اور دنیا میں ہمیں آبکار بنا دے گا۔ میں اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ انگلش لٹریچر اور سائنس ہے۔۔ ۔۔۔اب بہت سے ایسے علوم ایجاد ہوچکے ہیں کہ جن کو ہمارے باپ دادا نہ جانتے تھے۔ وہ اس زمانے کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔ اگر ہم پرانی لکیر کو پیٹتے رہے تو گویا ہم

موجودہ زمانے سے سینکڑوں برس پیچھے ہٹتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو آگے بڑھنا چاہیے۔''[۱۳]

اس لحاظ سے سر سید احمد خان انگریز حکومت کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرناچاہتے تھے۔ اور اس طرح ان کو اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کیونکہ انگریز حکومت اس وقت ہندوستان میں اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے ترقی کے جھنڈے گاڑ رہی تھی۔ اور ہندوستا ن کی عوام کو سہولیات فراہم کر رہی تھی۔ اس لیے سر سید احمد خان نے صرف انگریز وں حکومت کے ساتھ مفاہمت میں ہی مسلمانوں کی خیرخواہی دیکھ رہے تھے۔بلکہ وہ انگریز حکومت کے ساتھ وفاداری کے اصول کو اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔تاکہ مسلمان بھی حکومت کے ساتھ تعاون کی فضا میں ترقی کی طرف گامزن ہوسکیں۔

قاضی جاوید اپنی کتاب ''سرسید سے اقبال تک''میں اس صورت حال کا ذکر کرتے ہیں۔'' میری رائے یہی رہی کہ ہماری گورنمنٹ اور ہندوستان کی رعایا میں ایسی محبت اور یگانگت ہوجائے کہ ہر ایک کو امور مذہبی اور رسوم ورواج سے کچھ سروکار نہ رہے، مگر تمام رعایا اور ہماری گورنمنٹ انتظامِ ملکی میں ایک رائے ایک قصہ اور ایک ارادہ رہیں اور تمام ہندوستاں کی رعایا گورنمنٹ انگلشیہ کو اپنا بادشاہ سمجھ کر اس کی خیر خواہی اور رفاقت میں رہے۔۔۔۔۔جن مسلمانوں نے ہماری سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی ہے میں ان کا طرف دار نہیں ہوں۔میں ان سے بہت ناراض ہوں ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کواپنے مذہب کی بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا تھا جو اہل کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں۔ نبیوں پر ایمان لائے۔ خدا کے دیئے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور ایمان لانا عین ہمارا ایمان ہے۔''[۱۴]

اس پس منظر میں وہ انگریز حکومت کے ساتھ پاسداری کو مذہب اسلام کا حصہ سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ غداری کو مذہب اسلام کے حکم کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور ان کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کے خواہاں تھے۔ اور ان کی انگریزی تہذیب کے طور اطوار سیکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ سرسید احمد خان ہندوستانی

قوم کو انگریزوں کے مقابلے میں بہت ہی پست قوم سمجھتے تھے اور ان کی ترقی اور خوشحالی اور انکی تہذیب کی بقا صرف اسی بات میں محسوس کرتے تھے کہ وہ انگریزوں کی تہذیب کو اپنائیں ان کی ترقی اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرکے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں اپنے آپ کو شامل کریں۔

اس کے بارے میں قاضی جاوید ''اپنی کتاب'' سرسید سے اقبال تک ''میں لکھتے ہیں۔

> ''میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے ادنیٰ تک، امیر سے غریب تک، سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک، عالم ،فاضل سے لے کرجاہل تک، انگریزوں کی تعلیم وتربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔۔ ۔۔فرض کرو ہندوستانی اور انگریز ایک آزاد ملک میں جا بساوے جائیں اور بالفعل جو عادتیں اور طرز زندگی اور پرائیویٹ لائف ہندوستانیوں کی ہے۔ وہ ایسی ہی رہے۔ اور جو انگریزوں کی ہے وہ ہو بہو ویسی ہی رہے تو ہرگز انگریز ہندوستانیوں کے پاس بھی کھڑے نہ ہوں۔ اور جانور سے زیادہ نہ سمجھیں۔''[۱۵]

سرسید احمد خان ہندوستانی عوام کو انگریزوں کے مقابلے میں ایک غیر مہذب قوم سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسی بات کو عوام کے مفاد میں سمجھا کہ وہ اپنے آپ کو مہذب قوموں میں شامل کرنے کے لیے نہ صرف انگریزوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم سے استفادہ کریں بلکہ ان کی تہذیب کو بھی اپنائیں۔ معاشی خوشحالی میں اپنا نام پیدا کریں اور غربت اور جہالت سے چھٹکارا حاصل کریں۔ مزید برآں مذہبی تحقیق کی تفصیلات میں سرسید احمد خان کا یہ محرک تھا کہ ہندوستان میں مسلم غریب اور پسے ہوئے طبقے کا ایک نظریہ مرتب کیا جائے کہ جس میں مسلمانوں کی نئی نسل کو مغربی تہذیب کے آئینے میں اسلام کی سچائی کا یقین دلایا جائے اس کے لیے انہیں اسلام کی ایک نئی توجیہ پیش کرنا پڑی۔ جس میں انہوں نے مغربی فلسفے کو خوش آمدید کہا اور اسے اسلامی فلسفے کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی۔ اوریہ موقف اختیار کیا۔ مغربی تہذیب وثقافت کے بنیادی یونانی فلسفے سے استفادہ کیا جائے۔

اس موقف کی وضاحت کے لیے قاضی جاوید ''سرسید سے اقبال تک'' میں لکھتے ہیں۔

''اس بابت میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ برصغیر میں جدید مغربی علوم وفنون اور تہذیب و ثقافت کے اثرات کی آمد سے درحقیقت وہی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جو قرون وسطیٰ میں اسلامی تہذیب اور یونانی فلسفے کے ملاپ کے وقت پیدا ہو گئی تھی۔ لہذا اہل دانش وفکر کا فرض ہے کہ وہ حکمائے قدیم کی طرح نئے علوم وفنون کی روشنی میں اسلامی الہیات کی تشکیل نو کریں۔ ۔۔ یہی باعث ہوا کہ بہت سے مسائل یونانی فلسفے اور علم طبعی کے، جو تیسری قسم کے تھے، مسلمانوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر لیے۔ اور رفتہ رفتہ مذہبی مسائل کے تسلیم ہونے لگے، حالانکہ ان کو مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔''[۱۶]

دراصل جس پہلو کی جانب سر سید احمد خان توجہ دلارہے ہیں یہ مسلمانوں کا دور عروج تھا۔ جس میں مسلمان کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک انتہائی پر اعتماد قوم کی طرح یونانی فلسفیانہ موشگافیوں کو اسلام کی حقانیت سے لغو قرار دیتے تھے۔ جبکہ زوال کے دور میں اسلامی تعلیمات کو سائنس اور فلسفہ کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریقہ کار میں مسلمان پراعتماد نظر نہیں آتے بلکہ وہ ایک معذرت خواہانہ اور دفاعی نقطہ نظر میں نظر آتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آج اسلام کو اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے سائنس کی ضرورت ہے۔

مغربی تہذیب کے علوم پر مغربی دانشوروں نے کچھ اس طرح اپنے ذہنیت کی تہہ چڑھائی کہ مسلم دانشور اور حکمران طبقہ صرف اور صرف مغربی تہذیب اور مغربی جدیدیت کو ہی اپنی تمام تر خوشحالی کے لیے مسیحا سمجھنے لگا۔ اس نے نہ صرف عام ذہنیت کے مسلمانوں کو مغرب سے مرعوب کیا بلکہ اسلامی دنیا کے جلیل قدر عالم، مبلغ، مصلح، مفکر بھی اس دھوکے کا شکار ہوئے۔ مگر بہرحال ہندوستان میں ان جدید مغربی علوم اورنظریات کی وجہ سے حقیقتاً ایک جدید علم الکلام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس موضوع پر سرسید احمد خان نے خصوصی توجہ دی۔ سر سید احمد خان نے اسلامی اصولوں، عقیدوں اور قدروں کی اس انداز میں تاویل کرنے کی کوشش کی کہ وہ مغربی تہذیب سے ہم آہنگ نظر آئیں دارالعلوم دیوبند کی مسلم ثقافت کی بقا میں اہم کردار ادا کیا۔

دارالعلوم دیوبند چونکہ ایک دینی اور علمی ادارہ تھا اس لیے اس ادارے سے منسلک

علماء کرام نے مسلمانوں کے ثقافتی ،تاریخی ،دینی ورثے کو محفوظ بنانے کے لیے ایک خاص نصاب کو ترتیب دیا جس میں انھوں قرآن، حدیث، فقہ، منطق، سیرت، اور عربی ادب پرمشتمل مضامین کو شامل کیا گیا۔ اور تمام جدید اور مغربی علوم سے احتراز کیا۔ مسلمانوں کو مغربی علوم حاصل کرنے سے روکا گیا۔ اور مشرقی علوم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی۔ جوکہ دینی علوم پر مشتمل تھے۔ اس کے لیے بہت سے مدارس بھی تعمیر کیے گئے۔

قاضی جاوید اپنی کتاب''سرسید سے اقبال تک'' میں لکھتے ہیں۔''برصغیر میں علماء ہمیشہ سے غیر منظّم رہے۔ اسی بنا ء پر ہندی مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی زندگی میں ان کا کردار کمزور رہا ہے۔۔ ۔اول ذکر [دارالعلوم دیوبند]تحریک سے وابستہ لوگ اپنی تاریخی ،قومی، و ملی، روایات کو برقرار رکھنے کی خاطر نو آبادیاتی حکمرانوں سے عدم مطابقت پذیری کو ذریعہ نجات تصور کرتے تھے۔ جب کہ دوسرا گروہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ مطابقت پذیری کو فلاح کی راہ سمجھتا تھا۔۔ ۔۔۔جدید علوم محض جدید علوم نہیں تھے اور نہ ہی انیسویں صدی کے ہندوستان میں انہیں قبول کرنا نو آبادیاتی صورت حال کو قبول کرنے پر بھی دلالت کرتا تھا۔ لہذا علوم جدیدہ کی نفی درحقیقیت غیر ملکی حکمرانوں کی برتری ذہنی طور پر مسترد کرنے کے مترادف تھی''۔۱۷

یعنی کہ دارلعلوم دیوبند کے علماء بھی دو اقسام میں منقسم ہو گئے ایک طبقہ مغربی علوم سے احتراز کرنے کی تلقین کرتا۔ اور انگریزی تہذیب و ثقافت سے الگ رہنے اور مشرقی علوم وتہذیب کو اپنانے کی نصیحت کرتا۔ مگر ان دارلعلوم دیوبند کے علماء کرام میں سے ایک طبقہ مغربی علوم و ترقی اور یلغار کے اثرات دیکھ کر ان سے بچنے کو محال سمجھتے ہوئے ان علوم سے استفادہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔ جن میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور عبید اللہ سندھی نمایاں شخصیات ہیں۔

ان علماء کرام میں سے ایک مشہور شخصیت مولانا شبلی نعمانی جن کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے تھا۔ انہوں نے سر سید احمد خان کی علمی نظریات سے بھی استفادہ کیا۔ مگر ان سے بہت سے نظریات پر اختلاف بھی کیا۔ اس لحاظ سے مولانا شبلی نعمانی مغربی تہذیب و